۱۴واں ذاکر حسین یادگاری خطبہ

اکبر الہ آبادی :
نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۲ فروری ۲۰۰۳ء

ذاکر حسین کالج
(دہلی یونیورسٹی)
جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی

۱۴واں ذاکر حسین یادگاری خطبہ

اکبر الٰہ آبادی :
نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

شمس الرحمٰن فاروقی

۱۲ فروری ۲۰۰۲ء
ذاکر حسین کالج
(دہلی یونیورسٹی)
جواہر لعل نہرو مارگ، نئی دہلی ۱۱۰۰۰۲

تعارف

گذشتہ کئی برسوں سے ذاکر حسین میموریل لکچر ہمارے کالج کی علمی زندگی کا حصہ بن گیا ہے۔ ۲۰۰۲ء کے خطبے کے لئے پروفیسر شمس الرحمٰن فاروقی کو دعوت دی گئی۔ پروفیسر فاروقی علمی وادبی حلقوں میں کسی تعارف کے محتاج نہیں۔ پچھلی چار دہائیوں میں شعروادب، تنقید، لسانی اور تہذیبی تاریخ اور دیگر اصناف میں ان کی تخلیقات سنگ میل کی حیثیت حاصل کر چکی ہیں۔

اپنے خطبے ''اکبر الٰہ آبادی: نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے اقدار'' میں فاروقی صاحب نے تاریخی وتہذیبی پس منظر میں اکبر الٰہ آبادی کی نظریاتی شاعری کے اجزاء کو پرکھا ہے اور ان کے طنز و مزاح کے پیچھے چھپے ہوئے کرب کی عکاسی کی ہے۔ ذاکر حسین کالج برادری اپنی علمی کاوشوں میں پروفیسر فاروقی کی شمولیت کو ایک اعزاز تصور کرتی ہے۔

سلمان ہاشمی

ذاکر حسین کالج
نئی دہلی

اکبرالہ آبادی : نئی تہذیبی سیاست اور بدلتے ہوئے اقدار

ہم میں سے اکثر کو اکبرالہ آبادی کی زندگی کے اہم حالات سے واقفیت ہے، لہٰذا میں یہاں صرف مختصراً ان کا اعادہ کروں گا۔ سید اکبر حسین کی پیدائش ۱۸۴۶ میں الہ آباد کے پاس جمنا پار کے بارہ نامی گاؤں میں ہوئی۔ ابتدائی تعلیم انہوں نے اپنے والد سید تفضل حسین سے حاصل کی۔ ان لوگوں کا خاندان بارہ کے علاقے میں مدت سے آباد تھا۔ قدامت پسند، متوسط الحال، اور عزت نفس کے پاس دار اس خاندان نے قدیم کلاسیکی تعلیم کی روایتوں کو برقرار رکھا تھا، لیکن ان کی مالی حالت اچھی نہ تھی۔ اکبر کو مجبوراً ۱۸۶۳ میں جمنا پر زیر تعمیر پل کے ٹھیکے دار کے یہاں کلرک کی ملازمت کرنی پڑی۔ اس درمیان انہوں نے اپنی کوششوں سے انگریزی کی اچھی استعداد بہم پہنچائی اور ۱۸۶۷ میں عدالت ضلع کے وکلاء کا امتحان بآسانی پاس کرلیا۔ انہیں ۱۸۶۹ میں نائب تحصیل دار مقرر کیا گیا، لیکن جلد ہی انہوں نے وہ نوکری ترک کردی اور ہائی کورٹ کے وکلاء کا امتحان پاس کر کے الہ آباد ہائی کورٹ میں وکالت کرنے لگے۔

چند برس کی وکالت کے بعد ۱۸۸۰ میں وہ منصف کے عہدے پر فائز کئے گئے۔ اس کے بعد وہ سرکاری ملازمت اور عہدوں میں مسلسل ترقی کرتے ہوئے ۱۸۹۴ میں سشن جج پر تعینات ہوئے۔ جلد ہی وہ بنارس میں، اور پھر دوسرے اضلاع میں ڈسٹرکٹ جج کے عہدے پر متمکن ہوئے۔ حکومت انگلشیہ نے انہیں ۱۸۹۸ میں خطاب خان بہادری سے سرفراز کیا۔ ملازمت سے سبک دوشی (۱۹۰۳) کے بعد وہ کوتوالی الہ آباد کے پیچھے اپنی تعمیر کردہ وسیع کوٹھی ''عشرت منزل'' میں آرام اور نیم خانہ نشینی کی زندگی گزارتے رہے، اگر چہ اس زمانے میں

انہیں آنکھوں کی تکلیف کے علاوہ اور بھی عارضے لاحق ہوئے، لیکن بحیثیت مجموعی ان کے وظیفہ یابی کے دن اچھے گذرے۔

زندگی کے آخری برسوں میں مہاتما گاندھی، ملک کی آزادی، اور ہندو مسلم اتحاد کے لئے مہاتما گاندھی کی جدوجہد سے اکبر کا شغف پہلے سے بھی فزوں ہو گیا۔ انہوں نے ان موضوعات پر اپنے خیالات کا اظہار ایک طویل نظم (یا مختصر نظموں کے طویل سلسلے) ''گاندھی نامہ'' میں کیا۔ اکبر نے ۱۹۲۱ میں اس دنیا سے کوچ کیا۔ اس وقت وہ ملک کے ادبی منظر نامے پر ایک نہایت قوت منداور سیاسی سماجی اعتبار سے وابستہ شاعر کی حیثیت سے اپنی شہرت کے بام عروج پر تھے۔

گذشتہ پانچ دہائیوں میں اکبر کے ساتھ شعروادب کے میدان میں کچھ اچھا سلوک نہیں کیا گیا۔ اپنی زندگی میں تو ان کی توقیر بے حد اور ان کی شہرت غیر معمولی تھی۔ انیسویں صدی کی آخری دو، اور بیسویں صدی کی اول دو دہائیوں میں ان کے دوستوں اور مداحوں کی فہرست تو اس وقت کا Who's Who in India معلوم ہوتی ہے! اس بات کے باوجود کہ اکبر کو سرسید کے خیالات اور گوشوارۂ عمل سے سخت اختلاف تھا، خود سرسید کے دل میں اکبر کا حب واحترام اس قدر تھا کہ انہوں نے اکبر کو علی گڑھ تعینات کرا لیا تا کہ ان کی صحبت کا جی بھر لطف اٹھا سکیں۔' اقبال نے اکبر کے ایک شعر کے بارے میں ان کو لکھا کہ آپ نے اس شعر میں ہیگل کا پورا فلسفہ بیان کیا ہے، بلکہ ''ہیگل کے سمندر کو ایک قطرے میں بند کر دیا ہے۔''[۲] مدن موہن مالوی نے اکبر الہ آبادی سے ہندو مسلم اتحاد کے موضوع پر نظمیں لکھوائیں۔[۳]

اکبر کی وفات کے بعد بھی ان کا کلام ایک دو دہائیوں تک مقبول رہا۔ ان کا کلیات تین

جلدوں میں ۱۹۰۹ سے ۱۹۲۱ کے درمیان چھپا تھا۔ اکبر کے زمانۂ حیات میں، اور ان کے بعد بھی یہ جلدیں کئی بار چھپیں۔ پہلی جلد تو ۱۹۳۶ تک گیارہ بار چھپ چکی تھی۔ دوسری نے ۱۹۳۱ تک سات اور تیسری نے ۱۹۴۰ تک پانچ اشاعتیں دیکھیں۔ لیکن آج معاملہ بالکل مختلف ہے۔ ''گاندھی نامہ'' (۱۹۱۹ تا ۱۹۲۱) صرف ایک بار ۱۹۴۸ میں چھپی، اور مدت سے نایاب ہے۔ خود کلیات کی تیسری جلد کی اشاعت میں بہت تاخیر ہوئی تھی اور وہ اکبر کی وفات سے بمشکل چند ہفتے قبل اگست ۱۹۲۱ میں منظر عام پر آ سکی تھی۔ (ممکن ہے ان تعویقوں میں اکبر کے بیٹے اور ان کے کلام کے مختار عام عشرت حسین کی بھی سست مزاجی کو دخل رہا ہو)۔ جہاں تک ہمیں معلوم ہے، عشرت حسین نے کلیات اکبر کی چوتھی جلد کو شائع کرنے کا کوئی اہتمام نہیں کیا، اور نہ ''گاندھی نامہ'' کی اشاعت پر انہوں نے توجہ کی۔ اکبر الٰہ آبادی کے پوتے محمد مسلم رضوی نے ''گاندھی نامہ'' کو ۱۹۴۸ میں کتابستان، الٰہ آباد سے چھپوایا۔ اکبر کا کچھ غیر مطبوعہ کلام قمر الدین احمد بدایونی کی کتاب ''بزم اکبر'' (۱۹۴۰) میں مل جاتا ہے۔ یہ کتاب بھی اب کمیاب ہے۔ سرور تونسوی مرحوم نے مکتبۂ شان ہند سے اکبر کا ایک کلیات شائع کیا تھا۔ اس میں کلیات کی چوتھی جلد کا بھی کچھ کلام شامل ہے۔ صدیق الرحمٰن قدوائی نے ان میں سے کچھ اشعار کو اپنے انتخاب میں درج کیا ہے۔

کلیات اکبر کی چوتھی جلد کراچی سے ۱۹۴۸ میں ضرور چھپی، لیکن وہ ہندوستان میں بہت کم لوگوں تک پہنچی، اور پاکستان میں بھی اب شاذ و نادر ہی ملتی ہے۔ ایک تازہ اطلاع کے مطابق اس جلد کا وہ نسخہ جو مولانا عبدالماجد دریابادی کی ملک تھا، اب دریافت ہو گیا ہے۔ مکتبۂ شان ہند کے کلیات اکبر کو عالمانہ یا اختیار دار ایڈیشن نہیں کہہ سکتے۔ قومی کونسل برائے

فروغ اردو اب ایک مکمل ایڈیشن شائع کر رہی ہے۔ یہ ایڈیشن ہر چند کہ عالمانہ اور تنقیدی نہ ہوگا، لیکن اس میں صحت کا خیال رکھا گیا ہے اور کوشش ہو رہی ہے کہ عبدالماجد دریابادی کے نسخے پر جو حواشی اور ضروری معلومات مولانا دریابادی نے درج کئے تھے، وہ اس ایڈیشن میں شامل ہو جائیں۔

لہٰذا موجودہ صورت حال یہ ہے کہ ہمارے سب سے بڑے طنز نگار کی حیثیت سے اکبر کی شہرت کو کوئی بٹہ نہیں لگا ہے، لیکن ان کے پڑھنے والوں کی تعداد کم ہو گئی ہے۔ اردو کے نقادوں نے کم و بیش یک زبان ہو کر ان کی نکتہ چینی کی ہے کیوں کہ اکبر انہیں ترقی، سائنس، اور روشن خیال طرز فکر و حیات کے دشمن نظر آتے ہیں۔

ہمارے نقادوں نے اکبر کے ساتھ جو سلوک کیا، بلکہ یوں کہیئے کہ جو بدسلوکی روا رکھی، اس کی کم از کم دو وجہیں اور ہیں۔ ایک وجہ تو ادبی ہے، اور دوسری غیر ادبی۔ ادبی وجہ تو یہ ہے کہ اردو نقادوں کی فہرست استناد میں طنزیہ اور مزاحیہ شاعری بہت پست مقام کی حامل ہے۔ اردو میں طنزیہ مزاحیہ شاعری کی روایت بے شک بہت توانگر اور توانا ہے، لیکن اوائل بیسویں صدی کے اردو نقادوں کی تربیت ایسی ہوئی تھی کہ وہ میتھیو آرنلڈ (Matthew Arnold) کی اس بات کو برحق سمجھتے تھے کہ ''اعلیٰ سنجیدگی'' (High seriousness) شاعری کا جزو لاینفک ہے۔ کوئی پچاس برس ادھر کا اپنا تجربہ بھی مجھے اب تک یاد ہے کہ مجھے اس وقت کتنا رنج اور کس قدر زیادتی اور دھوکے کا احساس ہوا جب میں نے آرنلڈ کا یہ قول پڑھا کہ انگریزی کے مشہور طنز نگار شعراء ڈرائڈن (John Dryden) اور پوپ (Alexander Pope) انگریزی شعر کے نہیں، بلکہ انگریزی نثر کے شاہکار ہیں۔ اگر میرے اساتذہ اس رائے کو پوری طرح تسلیم نہ بھی کرتے تھے

تو انہیں یہ فیصلہ دینے میں کوئی جھجک بھی نہ ہوتی کہ ڈرائڈن درجۂ دوم کا شاعر ہے۔ اس پر طرہ محمد حسین آزاد کی تنقیدیں اور تعریفیں کہ طنز اور ہجو "غیر مہذب" اصناف ہیں، بالخصوص جب سودا جیسا شاعر انہیں برتے۔ سودا کے بارے میں محمد حسین آزاد کو سنیئے:

> بڑھاپے تک شوخی طفلانہ ان کے مزاج میں امنگ دکھاتی تھی ... ذرا سی ناراضی میں بے اختیار ہو جاتے تھے۔ کچھ اور بس نہ چلتا تھا، جھٹ ایک ہجو کا طومار تیار کر ڈالتے تھے۔ غنچہ نام ان کا غلام تھا، ہر وقت خدمت میں رہتا تھا اور ساتھ قلم دان لئے پھرتا تھا۔ جب کسی سے بگڑتے تو فوراً پکارتے، ارے غنچہ لا تو قلمدان .... پھر شرم کی آنکھیں بند۔ اور بے حیائی کا منھ کھول کر وہ بے نقط سناتے تھے کہ شیطان بھی امان مانگے۔"

یہ باتیں اس نتیجے کے لئے کافی تھیں کہ اردو کے نقاد تمام ظریفانہ اور طنزیہ شاعری کو شک کی نگاہ سے دیکھنے لگ جائیں۔ اکبر جس جوش اور قوت کے ساتھ سیاسی اور سماجی مسائل کے ساتھ اپنی شاعری میں معاملہ کرتے تھے وہ ان کی گری ہوئی پوزیشن کو سنبھالنے کے لئے کافی نہ سمجھا گیا۔ آج شاید ہی کوئی اردو کا نقاد ایسا ہوگا جو اکبر کو اردو کے دس بڑے شعراء میں شمار کرے۔

سرور صاحب ان چند نقادوں میں ہیں جنھوں نے اکبر کے مقاصد کی متانت اور وزن کو سمجھا، اور ان کی بصیرت کی قوت کا اعتراف کیا۔ انھوں نے کہا کہ " آپ ان کے خیالات سے اتفاق نہ بھی کریں، مگر ان کے اشعار پر مسکرائے اور اکثر غور کئے بغیر نہیں۔

رہ سکتے۔ یہی ان کا مقصد تھا۔''[5] لیکن اکبر کے لئے تاحیات جذبۂ تحسین رکھنے کے باوجود سرور صاحب بھی خود کو اس بات پر تیار نہ کر سکے کہ اردو کے عظیم ترین شعراء کی محفل میں اکبر کے لئے بھی جگہ استوار کی جائے۔

موجودہ زمانے میں اکبر کی مقبولیت کم ہونے کی ایک وجہ ان کی ذاتی زندگی اور ان کے سیاسی عقائد کے درمیان تضاد کی واضح خلیج بھی ہے۔ اپنے شعر میں تو اکبر خود کو تمام انگریزی طور طریقوں کا سخت دشمن ظاہر کرتے ہیں۔ لیکن وہ خود انگریزی راج کے ایک خاصے بزرگ عہدے دار تھے، اور انھیں صاف صاف اس بات پر فخر بھی تھا کہ ٹامس برن omas (ThBurn) جو ایک زمانے میں یو۔ پی۔ کا چیف سکریٹری تھا، ان کا بہت لحاظ کرتا تھا۔[6] ملکہ وکٹوریہ کی گولڈن جوبلی (۱۸۸۷) کے موقعے پر انھوں نے ''مسٹر ہاویل، جج'' کی فرمائش پر ایک مدحیہ قصیدہ بھی لکھا۔[7] انگریزوں سے سخت نفرت کے باوجود اکبر نے اپنے بیٹے عشرت حسین کو اعلیٰ تعلیم کے لئے لندن بھیجا اور پھر ان کا یو۔ پی۔ کی سول سروس میں بطور ڈپٹی کلکٹر شریک ہونا بھی منظور کیا۔ ظاہر ہے کہ ان باتوں کا کوئی جوڑ نکتہ چینی کے ان فقروں اور ان طنز بھرے تحقیری اشعار سے نہیں جو اکبر کی زبان قلم سے اہل مغرب اور ان کے مداحوں کے لئے مسلسل ادا ہوتے رہتے تھے۔

اس بات کا امکان ہے کہ اکبر کو اس تضاد کا احساس رہا ہو۔ اور یہ بھی ممکن ہے کہ ذاتی زندگی میں اس دورنگی[8] کے احساس نے ان کے یہاں زجر و ملامت کی لے اور تیز کر دی ہو اور مغربی، خاص کر برطانوی طور طریقوں اور نظام حیات سے ان کا اظہار براءت شدید تر کر دیا ہو۔ اس میں تو کوئی شک نہیں کہ وہ اس بات سے بخوبی واقف تھے کہ دھارے کے خلاف کوئی تیر

نہیں سکتا، لیکن ان کی نگاہوں میں اصل المیہ کچھ اور تھا۔ اکبر کے خیال میں المیہ درحقیقت یہ تھا کہ وہ لوگ بھی غرقابی سے نہ بچ سکے جنھوں نے دھارے کے ساتھ بہنا پسند کیا۔ خود کو جدید (انگریز) بنانے کے چکر میں ہندوستانیوں نے اپنا ماضی، اپنی روایات، اپنے نظام عقائد، سب تج دئے، لیکن پھر بھی وہ خود کو مغربی رنگ میں پوری طرح رنگا ہوا وہ جدید انسان نہ بنا سکے جس کی توقع مکالی (Macaulay) کو تھی مندرجہ ذیل شعر میں دل سوزی المیہ دردمندی کی حد کو چھو رہی ہے۔

مرید دہر ہوئے وضع مغربی کرلی نئے جنم کی تمنا میں خودکشی کرلی ۹

غور طلب بات یہ ہے کہ شعر میں فاعل کا اظہار نہیں کیا گیا ہے۔ خودکشی کرنے والا واحد غائب، واحد متکلم، جمع غائب، جمع متکلم، واحد حاضر، جمع حاضر کوئی بھی ہوسکتا ہے۔ ایک نسبتاً طویل قطعے میں اکبر نے اسی کشمکش کا اظہار ایک ذاتی درد اور احساس زیاں کے ساتھ کیا ہے، لیکن یہاں بھی متکلم کوئی فرد واحد بھی ہوسکتا ہے اور اس زمانے کے متوسط گھرانے کا پورا مسلم معاشرہ بھی۔

قدیم وضع پہ قائم رہوں اگر اکبر تو صاف کہتے ہیں سید یہ رنگ ہے میلا
جدید طرز اگر اختیار کرتا ہوں خود اپنی قوم مچاتی ہے شور و واویلا
جو اعتدال کی کہیے تو وہ ادھر نہ اُدھر زیادہ حد سے دئے سب نے پاؤں ہیں پھیلا
اِدھر یہ ضد ہے کہ لمیڈ بھی چھو نہیں سکتے اُدھر یہ دھن ہے کہ ساقی صراحی ے لا
اِدھر ہے دفتر تدبیر و مصلحت ناپاک اُدھر ہے وحی ولایت کی ڈاک کا تھیلا
غرض دوگونہ عذاب است جان مجنوں را بلا ے صحبت لیلیٰ و فرقت لیلیٰ ۱۰

اکبر کے قدح خواں (اور قریب قریب سب ہی جدید نقاد اکبر کے قدح خواں ہی ہیں) مندرجہ بالا طرح کے اشعار اور نظموں کو نظر انداز کرتے ہیں، اور سارا زور اکبر کے اسی کلام پر صرف کرتے ہیں جس کی رو سے انھیں نئی روشنی کا اندھا اور استدلال سے عاری نقاد ثابت کیا جا سکے، یا پھر یہ دکھایا جا سکے کہ اکبر جان بوجھ کر الٹی گنگا بہانا چاہتے تھے کہ وہ جس ماضی کے دلدادہ تھے وہ عموماً ناپسندیدہ اور بہر طور مردہ یا نزع کی حالت میں گرفتار تھا۔ اور اکبر کے بارے میں یہ فیصلہ صرف ان لوگوں کا نہ تھا جو برطانوی راج کو ہندوستان کے لئے باعث برکت نہیں تو تاریخ کے سفر کا ایک ضروری پڑاؤ یقیناً قرار دیتے۔ اکبر کے لئے ہمدردی ان لوگوں کے بھی دل میں نہ تھی جو برطانوی راج کے مخالف تھے اور اس سے انھیں کچھ لینا دینا نہ تھا۔

اکبر کے بارے میں زیادہ تر جدید تنقید میں تصور کی تہ دار، اور بعض اوقات بالکل کھلی کھلی رائے یہی ہے کہ ٹھیک ہے، وہ اپنے زمانے میں بے حد مقبول تھے اور عمدہ طنزیہ شاعر تھے، لیکن جن اقدار، تصورات اور آدرشوں کو وہ قیمتی گردانتے تھے انھیں تو اکبر کے حین حیات ہی میں شکست فاش نصیب ہو چکی تھی۔ لہٰذا جب وہ اقدار ہی نہ رہے جن سے اکبر کی شاعری کو ایقان اور عقیدے کا سہارا تھا، تو پھر ناگزیر ہے کہ ان کی شاعری دوسروں کے لئے جگہ خالی کر دے۔ نقادوں کا کہنا یہ ہے کہ اکبر کا گوشوارۂ عمل منفی ہے، اس لئے ان کی شاعری بھی منفی ہے، اور ہم اسے آج کے جدید دور میں کسی قوت کا حامل دیکھ سکتے ہیں نہ معنویت کا۔

لیکن یہ بات ہی غلط ہے کہ جو لوگ، پارٹی، یا تصورات، جو کسی طنز نگار کا ہدف تھے ان کی شکست یا موت کے ساتھ ان کے بارے میں لکھی ہوئی طنزیہ تحریر بھی متروک یا ناقبول ہو جاتی ہے۔ اگر طنز و مزاح صرف وقتی اور مقامی معنویت کی شے ہیں، اور زمانہ بدلنے

یا گزرنے کے ساتھ ان کی قیمت ، معنویت ، یا اہمیت کم ہو جاتی ہے تو یونان کے ارسٹوفینیس (Aristophanes) سے لے کر سنسکرت کے طنز و ہجو نگاروں تک ، پھر عرب و ایران کے (فحش یا غیر فحش) ہجو گویوں سے لے کر انگریزی کے جاتھن سوئفٹ (Jonathan Swift) اور اردو کے جعفر زٹلی تک سینکڑوں مصنف ہیں جن کی بہت ساری نظم ونثر آج ہمارے لئے بے معنی ہوتی ، بلکہ وہ آج باقی ہی نہ ہوتی ۔ ظاہر ہے کہ ایسا نہیں ہے۔ اوراس طرح یہ بھی ظاہر ہے کہ اکبر کی طنزیہ شاعری کو ہم صرف یہ کہہ کر ٹال نہیں سکتے کہ زمانے کے ساتھ اکبر کی معنی خیزی بھی گذر گئی اور آج وہ دفتر پارینہ ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ اپنے زمانے کے مسائل کی طرف، اور خاص کر'' ترقی '' سے متعلق مسائل کی طرف اکبر کا رویہ اتنا سادہ اور سیدھی لکیر جیسا بھی نہ تھا جیسا کہ ان کے نقاد ہمیں باور کرانا چاہتے ہیں ۔ اکبر بڑے پیچیدہ شاعر ہیں ۔ انھیں صبح کے اخبار کی طرح نہیں پڑھا جاسکتا۔ اکبر کے شکوک اور خوف اور آئندہ زمانے کے بارے میں ان کی تاریک پیشین گوئیاں صرف ایک ضدی قدامت پسند ذہن کی پیداوار نہیں ۔ ان میں کچھ اور بھی ہے۔

سچ پوچھئے تو اکبر اپنے زمانے کے ان چند لوگوں میں تھے جنھوں نے یہ بات دیکھ لی تھی کہ سرسید کے اصلاحی گوشوارۂ عمل اور لارڈ میکالی (Lord Macaulay) کے منصوبوں میں بہت کچھ مشترک تھا۔ اکبر خوب سمجھتے تھے کہ جس چیز کو'' ہندوستانی نشاۃ الثانیہ'' کہا جارہا ہے، یا کہا جائے گا ، وہ پچھلی جدید کاری کی ایک طاقتور لہر کے سوا کچھ نہیں ۔ سرسید کے '' اینگلو اورینٹل کالج '' (Anglo-Oriental College) علی گڑھ میں بہت کم عنصر ایسا تھا

جسے ''اینگلو'' (انگریزی) کہا جا سکتا تھا اور ''اورینٹل'' (مشرقی) عنصر تو اس سے بھی کم تھا۔ ارادے اور ذہن کی اپنی تمام تر قوت اور نیک نیتی کے باوجود سرسید کے پاس وہ ساز و سامان نہ تھا، اور نہ ہی وہ صلاحیت تھی کہ وہ جدید سائنسی چھان بین اور مذہبی عقیدے دونوں کے امتزاج پر مبنی کوئی واحد ذہنی نظام تیار کر سکیں۔ یورپی روشن فکری (Enlightenment) کے معاصر نظام افکار میں سائنسی اور تفتیشی رویوں اور تصور کائنات کی کارفرمائی تھی، اور برطانوی تہذیب اس نظام افکار کی نمائندگی بھی خوب کرتی تھی۔ لیکن اس نظام افکار اور تصور کائنات کو آزادانہ اور دانشورانہ طور پر اختیار کرنا دیگر بات تھی، اور غلامانہ، یا خوشامدانہ، اور کم و بیش ایک کم تر درجے کے معاون کے طور پر اس کی تحسین اور انگریزی نوآبادیاتی وانتظامی ڈھانچے میں ہندوستان کی شرکت اور چیز تھی۔ ہندوستان میں انگریزوں کی حکمت عملی اس بات پر مبنی تھی کہ جدید سائنسی فکر ہندوستان میں آئے ضرور، لیکن وہ انگریز کے نوآبادیاتی وانتظامی ڈھانچے کی تحسین اور اس کے ساتھ تعاون کے طور پر آئے۔ یعنی اگر نئے علوم و افکار کو حاصل کرنا ہے تو انھیں انگریزوں کی دین کے طور پر ہی حاصل کرو۔ انگریزوں نے اس بات کی پوری کوشش کی تھی کہ دونوں چیزیں (جدید علوم و افکار اور انگریزی سامراج سے خوش عقیدگی) ساتھ ساتھ آئیں۔ یہ ایسی حقیقت تھی جو اکبر کے زمانے میں تمام ہندوستانیوں پر افشا نہیں تھی۔ انیسویں صدی کے اواخر اور بیسویں صدی کے اوائل کی ہماری تہذیبی تاریخ میں اکبر اور اقبال کے سوا شاید ہی کوئی ایسا ہوگا جس نے اس حقیقت کا احساس و اظہار اس قدر زور و قوت سے کیا ہو۔ اور خاص کر اکبر تو یہ بات کہتے نہ تھکتے تھے کہ یہ محض خوش خیالی اور پر امیدی ہے، ان دو رویوں کا یکجا ہونا اجتماع نقیضین کا

حکم رکھتا ہے، اور ان پر بیک وقت ایک ہی عالم میں عمل پیرا ہونا غیر ممکن ہے۔

اکبر کو اپنے طور پر سر سید سے محبت بھی تھی۔ سر سید کے خلوص نیت، خلوص عمل، مشقت برائے قوم، تعلیم، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کی تعلیم کے مقصود سے ان کے دلی لگاؤ کی وہ قدر کرتے تھے۔ لیکن سر سید اور ان کی جسمانی اور معنوی اولادوں کا جب موازنہ کرتے تو ''اولادوں'' میں انھیں بہت کم باتیں قابل تعریف نظر آتیں، جب کہ علی گڑھ کے بڑے میاں کے لیے ان کے دل میں جگہ تھی۔ یہ شاید بے وجہ نہیں کہ ''کلیات اکبر'' کی ابتدا ایک غزل سے ہوتی ہے جس کے تین شعر بالترتیب حسب ذیل ہیں۔

واہ کیا راہ دکھائی ہے ہمیں مرشد نے
کردیا کعبے کو گم اور کلیسا نہ ملا

رنگ چہرے کا تو کالج نے بھی رکھا قائم
رنگ باطن میں مگر باپ سے بیٹا نہ ملا

سید اٹھے جو گزٹ لے کے تو لاکھوں لائے
شیخ قرآن دکھاتے پھرے پیسہ نہ ملا

جیسا کہ صاف ظاہر ہوگا، پہلے شعر میں ہندوستانیوں، اور خاص کر ہندوستانی مسلمانوں کے کج دار و مریز کا، اور اس کو حل کرنے میں ان کی ناکامیوں کا ذکر ہے۔ اس شعر کا ہدف سر سید تو ہیں ہی، لیکن اس کے سماجی اور اخلاقی مضمرات دور دور تک ہیں۔ دوسرے شعر میں سر سید کو بالواسطہ خراج تحسین ہے کہ خود ان کا دل تو صحیح مقام پر تھا۔ لیکن ان کی اولادوں نے باپ دادا کے روحانی اور دانشورانہ ورثے کو ضائع کر دیا۔ تیسرے شعر میں واضح طور پر سر سید پر یہ رائے ظاہر کی گئی ہے کہ ان کے طریق فکر و عمل نے مسلمانوں کو ترغیب دی کہ وہ قرآنی طرز حیات و فکر کو چھوڑ کر انگریزی طرز حیات و فکر اختیار کریں۔

سرسید کے انتقال پر اکبر نے دو شعر کا ماتمی قطعہ لکھا۔ اس میں انھوں نے سرسید کی راست نیت اور مشقت برائے قوم کا پورا اعتراف کیا۔

ہماری باتیں ہی باتیں ہیں سید کام کرتا تھا ؎ نہ بھولو فرق جو ہے کہنے والے کرنے والے میں
کہے جو چاہے کوئی میں تو یہ کہتا ہوں اے اکبر خدا بخشے بہت سی خوبیاں تھیں مرنے والے میں"

جب سید محمود الٰہ آباد ہائی کورٹ کے جج مقرر ہوئے تو انھیں یہ معلوم کر کے رنج ہوا کہ ہائی کورٹ کے انگریز جج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات اور ہندوستانی جج صاحبان کی شرائط ملازمت اور مراعات یکساں نہ تھیں۔ دونوں کے فرائض اور اختیارات ایک ہی تھے، لیکن انگریز ججوں کو ہر چیز میں ہندوستانیوں پر تفوق تھا۔ کچھ مدت بعد سید محمود نے حکومت کے نام ایک محضر تیار کیا جس میں انھوں نے مطالبہ کیا کہ انھیں اور انگریز جج صاحبان کو شرائط ملازمت اور مراعات میں ہر طرح برابر قرار دیا جائے۔ اس مطالبے کی بنیاد انھوں نے اصول مساوات و معدلت کے بجائے اس بات پر رکھی تھی کہ انگریزی زبان کے علم، انگریزی تعلیم، انگلستان میں قیام، رکھ رکھاؤ اور طرز بود و باش کے لحاظ سے وہ ہر طرح انگریز تھے۔"[۳] ظاہر ہے کہ یہ بات اکبر الٰہ آبادی کے بھی کان میں پڑی ہوگی، کہ وہ بھی اس وقت کی یو۔ پی۔ جوڈیشل سروس میں اچھے عہدے پر تھے۔ سید محمود کے طرز فکر و استدلال میں اکبر کو اپنے بدترین خوف اور شکوک سچ ہوتے نظر آئے ہوں تو کیا تعجب ہے۔ آگے چل کر انھوں نے سید محمود اور الٰہ آباد ہائی کورٹ کے چیف جسٹس سر جان ایج (Sir John Edge) کے درمیان ناچاقی، چیف جسٹس کے عُجب و غرور، اور پھر ہائی کورٹ کی ججی سے سید محمود کے استعفے کا قصۂ نامرضیہ بھی سنا ہوگا۔

ان باتوں نے اکبر کو اپنے خیالات پر اور بھی مستحکم کیا ہوگا اور انھوں نے اپنے موقف کو اور بھی مبنی برحق سمجھا ہوگا۔ان کا اس بات پر سخت غم وغصہ رہا ہوگا کہ سید محمود جو ایک انتہائی قدیم اور ممتاز خاندان کے چشم و چراغ تھے، جنھیں اردو کے علاوہ فارسی اور عربی ادب کی بھی کثیر معلومات تھی، اور جو ہندو مسلم تہذیب کی بہترین روایات کے پروردہ تھے، ان جیسا شخص اپنی انگریزیت کی توثیق اس غلو کے ساتھ کرے کہ شرقیت کا بالکل پتہ ہی نہ باقی رہے۔ پھر یہ کچھ حیرت کی بات نہیں کہ سید محمود کے انتقال (۱۹۰۳) پر اکبر کا قطعہ اگر ایک طرف مختصر ًا ماتم دارانہ ہے تو دوسری طرف اس میں ایک تلخ فتح مندی بھی نمایاں ہے۔

نہ وہ بک رہ گئے نہ سر سید دل احباب سے نکلتی ہے آہ
ذات محمود سے تسلی تھی لی انھوں نے بھی آج خلد کی راہ
بولی عبرت کہ ہوش میں آؤ اے حریصان شان وشوکت و جاہ
مٹ گیا نقش احمد و محمود رہ گیا لا الٰہ الا اللہ [۱۴]

لہٰذا اکبر کے تضادات ان کے اپنے زمانے کے تضادات تھے۔ اور اس میں بھی کوئی شک نہیں کہ آخری دنوں میں وہ اپنے ان داخلی تضادات کے حل کی طرف ٹٹولتے ہوئے سہی، لیکن بڑھ رہے تھے۔ اپنی زندگی کے بیش تر ایام میں ہندوستانی محاورے میں ''گورمنٹ سرونٹ'' (Government Servant) اور پھر ''پنشنر جج'' رہے تھے۔ اور وہ اپنے اندر یہ قوت نہ دیکھتے تھے کہ وہ جدو جہد آزادی اور مہاتما گاندھی کی کھلی حمایت کریں اور عملی سیاست میں کود پڑیں۔ لیکن انگریز، انگریزی راج، مغربی تہذیب، اور ان کے حمایتیوں پر کھلے الفاظ میں نکتہ چینی میں وہ کبھی پیچھے نہ رہے۔ اور یوں بھی، شاعر کا کام ڈنڈا یا جھنڈا اٹھانا نہیں۔

''گاندھی نامہ'' کے بہت پہلے انھوں نے دو الگ الگ شعروں میں کہا تھا۔

مدخولۂ گورمنٹ اکبر اگر نہ ہوتا اس کو بھی آپ پاتے گاندھی کی گوپیوں میں[15]

☆☆☆

بدھو میاں بھی حضرت گاندھی کے ساتھ ہیں گوخاک راہ ہیں مگر آندھی کے ساتھ ہیں [16]

اکبر نے اپنے لئے لفظ ''مدخولہ'' استعمال کیا ہے۔ اس سے صاف ظاہر ہے کہ انگریزی حکومت کے ملازموں کو وہ بیگم کے مقابلے میں داشتہ سے زیادہ درجہ دینے کو تیار نہ تھے۔ اس سے یہ بھی معلوم ہوتا ہے کہ بلند مرتبہ دنیاوی حیثیت کے باوجود انھیں اپنے آپ سے ایک طرح کی نفرت تھی کہ وہ انگریز کے نوکر تھے۔ مہاتما گاندھی کے پیروؤں کو اکبر نے ''گوپی'' کہا ہے۔ اس طرح گاندھی جی کی شخصیت ان کی نگاہ میں غیر معمولی طور، بلکہ تقریباً فوق الانسانی طور پر کرشمہ جاتی حیثیت رکھتی تھی۔ لفظ ''گوپی'' کے استعمال اور سری کرشن جی مہاراج کی طرف اشارے کی بناء پر اس شعر میں معنی کی متعدد تہیں ہیں۔ یہاں میں صرف ایک کی طرف توجہ دلانا چاہتا ہوں۔ وطن عزیز کے لئے مہاتما گاندھی اصول مردی اور قوت تولید اور زرخیزی کا درجہ رکھتے ہیں۔ وطن عزیز اصول نسائی کا حکم رکھتا ہے، جسے گاندھی کے وجود سے قوت نمو اور زرخیزی حاصل ہوگی۔ دوسرے شعر میں اکبر نے ''بدھو میاں'' کی اصطلاح یا علامت خود اپنے لئے استعمال کی ہے۔ کہا جاتا ہے کہ مولانا محمد علی کو گمان گذرا تھا کہ ''بدھو میاں'' کو اکبر نے خود مولانا محمد علی کا مدلول بنایا تھا۔ مولانا اس پر شاید کچھ آزردہ بھی ہوئے تھے اور اکبر نے صفائی پیش کی تھی کہ ایسا نہیں ہے۔ ''گاندھی نامہ'' کے ایک شعر میں صاف اشارہ ہے کہ ''بدھو میاں'' سے کوئی اور نہیں بلکہ اکبرالٰہ آبادی ہی مراد ہیں۔

بدھو کا لفظ تھا فقط اک مصلحت کی بات　　دل میں مرے نہاں ہے جو ہے اصلیت کی بات [۱۷]

اکبر نے ''گاندھی نامہ'' اپنی حین حیات میں شائع نہ کیا۔ قمر الدین احمد کا بیان ہے کہ اکبر کہتے تھے کہ میں انگریزوں کی مخالفت کھل کر کروں تو یہ بے اثر اور نقصان دہ بات ہوگی۔ انھوں نے قمر الدین احمد سے ایک بار کہا کہ ''جب میرا یقین ہے کہ حکومت سے کھل کر لڑنا مضر ہے تو بھلا میں کیا کہوں، اور میرے کہنے سے ہو بھی کیا سکتا ہے؟'' زندگی کے بالکل آخری دنوں (فروری، ۱۹۲۱) میں اکبر نے قمر الدین احمد سے کہا:

> لوگوں کا خیال ہے میں اپنی پنشن کے خیال سے قومی کام میں سامنے نہیں آیا۔ یہ غلط ہے۔ اگر آج میں روپے کی خاطر قوم کا کام کروں تو کیا مجھ کو پنشن سے زیادہ فائدہ نہ ہو؟... میں دو باتوں سے گھبراتا ہوں، ایک تو عشرت کے مصیبت میں پڑنے کے خیال سے، دوسرے اس خیال سے کہ میں اس پیرانہ سالی میں اپنے جسم میں اتنی سکت نہیں پاتا کہ جیل کے مصائب اٹھا سکوں۔'' [۱۸]

لیکن ''گاندھی نامہ'' میں اکبر پوری طرح کھل کھیلے۔ انھوں نے کتاب کے سرنامے ہی پر یہ شعر لکھا۔

انقلاب آیا نئی دنیا نیا ہنگامہ ہے　　شاہ نامہ ہو چکا اب دور گاندھی نامہ ہے [۱۹]

گویا وہ دعویٰ کر رہے ہیں کہ فردوسی کا شاہنامہ جو ملک گیری اور کشورستانی کے اصول پر مبنی ہے، اب اس کا زمانہ ختم ہوا، یعنی انگریزوں کی ملک گیری کے دن گئے، اب گاندھی، یعنی عوام الناس کے اصول کی داستان کا زمانہ ہے۔ شاہی اور کشور کشائی کے دن منسوخ ہوئے۔

اکبر کو اس بات کا پورا پورا احساس تھا کہ سیاسی فاتحوں کے طور طریقوں میں سیاسی مفتوحوں کے لئے کس قدر کشش اور جاذبیت ہوتی ہے۔ مفتوح خود کو فاتح کے رنگ میں رنگ لینا چاہتا ہے تا کہ تفاوت مابین کم ہو۔ اور اکبر کے زمانے کی ہندوستانی زندگی اور ادب میں بے شمار مثالیں اس بات کی موجود تھیں کہ مفتوح قوم کو غیر شعوری طور پر اس بات کی طرف راغب کیا جا سکتا ہے کہ وہ فاتح قوم کے اندر حاکم طبقے کے ساتھ اتحاد ذہنی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔ اور اس کا طریقہ یہ ہے کہ مفتوح قوم کی روزمرہ تہذیب میں فاتح تہذیب کے طاقتور اور مقبول علائم اور نشانات داخل کر دئے جائیں۔ مفتوح کو فاتح کی طرف مائل کرنے کے لئے تہذیبی حربے اگر سیاسی حربوں سے زیادہ موثر نہیں تو ان کے برابر اثر انگیز یقیناً ہیں۔

اکبر کی اہم ترین بصیرت یہ تھی کہ انھوں نے نو آبادیات کار قوم کی تہذیب اور اس کی سیاست، اس کے نظم حکومت، اور اس کے ضوابط کو متحد قرار دیا۔ اور یہی وجہ ہے کہ انھوں نے انگریز کو جواب دیا تو شاعری کے ذریعہ، کہ ہندو مسلم سماج میں شاعری سے زیادہ موثر اور قوت مند کوئی دوسرا تہذیبی حربہ نہیں ہے۔ اور یہی وجہ ہے کہ وہ ''گاندھی نامہ'' کو شاہنامۂ فردوسی کے متقابل رکھتے، حالانکہ ''گاندھی نامہ'' کئی مختصر اور سیاسی طور پر واضح منظومات کا مجموعہ ہے، اور شاہنامۂ فردوسی میں زمین پر قبضہ جمانے اور غیر اقوام کو بزور شمشیر محکوم بنانے کی طویل داستانیں ہیں۔ اس کے برخلاف ''گاندھی نامہ'' میں غیر قوم کو اپنے ملک سے بے دخل کرنے کی باتیں ہیں۔

یہ باتیں آج کل فیشن کے طور پر مقبول ہیں کہ آج کے مابعد نو آبادیاتی دور میں مغرب کی سامراجی، سرمایہ پرست تہذیب محیط الارضی (global) اقدار و تصورات کے نام پر ہماری تیسری دنیا کی تہذیب کو اپنا محکوم بنانے کے درپے ہے۔ فیشن کے طور پر کہی جانے کے باوجود

یہ بات ہندوستان جیسے ملکوں کے لئے اپنے اندر صداقت کا بڑا عنصر رکھتی ہے کہ مغرب کی تمنا ہے کہ تیسری دنیا کے لوگ اس کے تہذیبی اقدار و اطوار کو تا حد امکان قبول کرلیں۔ تہذیبی علائم کی سیاسی معنویت کو سمجھنے والوں میں اکبر ہمارے یہاں سب سے پہلے تھے۔

یورپ میں گو ہے جنگ کی قوت بڑھی ہوئی   لیکن فزوں ہے اس سے تجارت بڑھی ہوئی
ممکن نہیں لگا سکیں وہ توپ ہر جگہ   دیکھو مگر پئیرس کا ہے سوپ ہر جگہ [20]

آلات رسل و رسائل میں ترقی اور تبدیلی کے ساتھ ساتھ تجارت اور زندگی اور عشق کرنے کے بھی طریقوں میں ''ترقی'' اور تبدیلی آتی ہے۔

اب کہاں دست جنوں تار گریباں اب کہاں   پانیر اور دست مجنوں اور خبر ہے تار کی
لے لیا شیریں نے کمسریٹ میں ٹھیکہ دودھ کا   ریل بنوانے لگے فرہاد اب کہسار کی [21]

٭٭٭

پریوں کے عاشقوں کو سودا ہوا اسوں کا   جو پھاڑتے تھے جامہ اب کوٹ سی رہے ہیں [22]

٭٭٭

میں ہوا ان سے رخصت اے اکبر   وصل کے بعد تھینک یو کہہ کر [23]

ہندوستان میں انگریزوں کے طرز حکومت کو خود انگریز حکام نے اکثر '' جابرانہ، لیکن مہربان، اور قانون کا پابند'' (benevolent despotism, and the rule of law) کہا ہے۔ جابریت چاہے جتنی بھی مہربان کیوں نہ ہو، اس کی ایک نمایاں خصوصیت یہ ہے کہ وہ قواعد و ضوابط بکثرت نافذ کرتی ہے۔ اکبر کی نگاہ میں برطانوی قواعد و ضوابط کا وفور ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا کیوں کہ اس کے باعث ہندوستانیوں کو اپنا طرز حیات بدلنے پر مجبور ہونا پڑتا تھا۔

اکبر نے اکثر اس قواعدی وفور کے لئے ''لیسنس'' کا استعارہ برتا ہے۔

ہر گام پہ چند آنکھیں نگراں ہر موڑ پہ اک لیسنس طلب　　اس پارک میں آخر اے اکبر میں نے تو ٹہلنا چھوڑ دیا"

٭٭٭

راہ میں لیسنس ہی کافی ہے عزت کے لئے　　بس یہی لے لیجئے تلوار رہنے دیجئے [۲۵]

٭٭٭

پوچھتے کیا ہو کہ پیرو ہے یا ہرنس ہے　　بندہ جو کچھ ہو بہر حالت بلا لیسنس ہے [۲۶]

اکبر الٰہ آبادی کی بدلتی ہوئی دنیا میں صرف ان چیزوں کے زیاں کا درد نہیں جو کھو گئیں۔ انگریزوں کا مفتوح اور زیر نگیں ہندوستانی جب ان کے نو آبادیاتی نظام کا حصہ بنا تو اس نے جوش وفاداری میں انگریز کے بھی کان کاٹ لئے اور ''جابر لیکن مہربان'' دیسی افسر بدیسی سے بڑھ کر استبداد پسند نکلا۔

تھم میں تن جب لگنے لگے جب دھوتی سے پتلون اگا　　ہر پیڑ پہ اک پہرہ بیٹھا ہر کھیت میں اک قانون اگا [۲۷]

اکبر کے کلام کا وہ حصہ جدید نقادوں کے لئے سب سے زیادہ برہمی کا باعث بنا ہے جہاں وہ پایپ کے پانی اور چھاپہ خانہ اور اخبار اور ریل گاڑی جیسی کھلی ہوئی منفعت بخش ایجادات کو بھی بظاہر مسترد کرتے ہوئے نظر آتے ہیں۔ سرسری نظر سے پڑھئے تو واقعی تعجب، بلکہ افسوس بھی ہوتا ہے کہ اکبر نے جدید اور روشن خیال زندگی کی ایسی کارآمد اور ضروری اشیاء کو خیر مقدم کرنا تو کجا، انھیں اپنے یہاں بار دینے سے بھی انکار کیا۔ لیکن اصل معاملہ کچھ اور ہے۔ اکبر کا احتجاج ترقی کے ان نئے وسائل کے خلاف نہ تھا۔ ان کا احتجاج یہ تھا کہ ان کی نظر میں یہ چیزیں غلامی کی علامت تھیں، اور یہ کہ نام نہاد ترقی اور بہتری کے پردے میں یہ تبدیلیاں ہندوستانی

طرز معاشرت اور تہذیب کو تباہ کرنے کا کام کر رہی تھیں۔ ان تبدیلیوں (مثلاً پانی کے نل کے ذریعہ گھر بیٹھے پانی کی سہولت) کا فائدہ تو چند ہی لوگ اٹھا سکتے تھے، لیکن اکبر کی نگاہ پانی کے پائپ کے ساتھ واٹر ٹیکس، سڑکوں پر کیچڑ اور آب استادہ کی فراوانی، اور اس کی پیدا کردہ ماحولیاتی آلودگی پر بھی تھی۔ شہروں میں واٹر ورکس کے قیام کا ایک ناپسندیدہ نتیجہ ان کی نظر میں یہ بھی تھا کہ زندگی سے کنویں غائب ہونے لگے، اور روزانہ استعمال کے پانی کے سرچشمے کے طور پر ندیوں کا استعمال ختم ہونے لگا۔ علاوہ ازیں، انھیں یہ بھی احساس تھا کہ یہ نئے طریقے شہروں کی اقتصادی زندگی اور قدرتی ماحول پر برا اثر ڈال رہے ہیں۔

ٹاؤن ڈیوٹی دکھل مچ رہا ہے کچھ ہے یہ پیدا کیچڑ سے پانی کی روانی ایک طرف اور ساری صفائی ایک طرف[۲۸]

٭٭٭

کشت دل کو نفع پہنچے اشک ایسی چیز ہے دیدۂ گریاں پہ واٹر ٹیکس کی تجویز ہے[۲۹]

٭٭٭

یہ موج فیض ہے تہذیب کی یا اس کا طوفاں ہے کنواں موجود ہے گھر میں تو پھر پانی کا نل کیسا[۳۰]

اس بات کی وضاحت چنداں ضروری نہیں کہ گھر کے کنویں کو پانی کا ایسا سرچشمہ قرار دینا جو گھریلو، خالص، اور استعمال کنندہ کے پورے قابو میں ہے، کنویں کو پوری ہندوستانی تہذیب کی علامت بنا کر پیش کرنا ہے۔ اور میرے خیال میں اس سے بھی زیادہ اہم بات یہ ہے کہ اس تبدیلی کا مطلب اکبر کی نظر میں کیا تھا؟ ہم میں سے جو لوگ کرشن لیلا، اور ندی کنارے یا پنگھٹ پر گوپیوں اور پانی بھرنے والیوں کے ہجوم، وغیرہ باتوں کی تہذیبی اہمیت سے واقف ہیں وہ اس نکتے کو زیادہ طور پر محسوس کر سکتے ہیں کہ حساس دل والوں کے لئے ایسے پانی کا تصور کس

قدر ناپسندیدہ ہوگا جو تجارتی مال کی طرح کسی کمپنی یا ادارے کے قبضے میں ہو اور لوگ اس بات پر مجبور ہوں کہ پانی جیسی چیز بھی کمپنی یا ادارے سے قیمتاً حاصل کریں۔ پانی کی رسد اور تقسیم کے نئے طریقوں کے باعث ان تہذیبی اقدار و روایات، اور اس ادبی اور افسانوی سرمائے کے محو ہو جانے کا امکان تھا جن کا تعلق کنویں، پنگھٹ، ندی کے گھاٹ، اور باہر سے یا کچھ فاصلے سے پانی لانے اور لے جانے سے تھا۔

وہ ذہن جو ہندوستانی روایت کی گود میں پلا بڑھا تھا، اس کے لئے کنواں محض کنواں اور دریا محض دریا نہ تھا۔ پہلی بات تو یہ تھی کہ ندی اور کنویں کے پانی کی کوئی قیمت نہ تھی اور اس کی تجارت نہ ہوتی تھی۔ دیہات میں بھی، جہاں ذات پات کی تفریق یا دوسری وجوہ کی بناء پر کنویں بٹے ہوئے تھے، کسی کنویں سے پانی کا استحقاق رکھنے والے بے قیمت پانی لیتے تھے۔ دوسری بات یہ کہ کیفیت اور کمیت دونوں اعتبار سے کنویں یا ندی کے پانی پر پانی نکالنے والے کا اختیار تھا، یعنی وہ جانتا تھا کہ یہ پانی کیسا ہے اور کتنا ہے۔ پائپ کے پانی میں یہ بات نہ تھی، کہ یہاں تو صارف کے ہاتھ میں کوئی اختیار نہ تھا۔ واٹر ورکس والے جب چاہتے اور جتنا چاہتے، اور جس رفتار سے چاہتے، پانی مہیا کرتے تھے۔ اور پھر شاید سب سے اہم بات یہ تھی کہ کنواں یا دریا کا گھاٹ جذباتی اور روحانی لین دین کی جگہ تھے، اور سماجی تہذیبی اور مذہبی زندگی میں ان کی اہمیت تھی۔

دلی جیسے بڑے شہروں میں بھی کنوؤں کی کتنی اہمیت تھی اس کا کچھ اندازہ غالب کے خطوط سے ہو سکتا ہے۔ فتح دہلی کے بعد انگریزوں نے جو آفت ۱۸۵۷ اور ۱۸۵۸ میں دہلی والوں اور دہلی کی عمارتوں پر توڑی، اس پر بس نہ کر کے آئندہ کے تین چار برس میں ترقی اور پھر

ریل کی سہولت کے نام پر انگریزوں نے دہلی میں مزید توڑ پھوڑ کی۔ مجروح کے نام ایک خط مورخہ ۱۸۶۰ یا ۱۸۶۱ میں غالب لکھتے ہیں:

> قاری کا کنواں بند ہو گیا ہے۔ لال ڈگی کے کنویں ایک دم کھاری ہو گئے۔ خیر کھاری ہی پانی پیتے، گرم پانی نکلتا ہے۔ پرسوں میں سوار ہو کر کنوؤں کا حال دریافت کرنے گیا تھا... قصہ مختصر شہر صحراء ہو گیا تھا۔ اب جو کنویں جاتے رہے اور پانی گوہر نایاب ہو گیا تو یہ صحراء صحراءِ کربلا ہو جائے گا۔[۳۱]

پائپ کا پانی تمام کنوؤں کی جگہ تو نہ لے سکتا تھا، اور کنویں کے پانی کی طرح بے قیمت بھی نہ تھا۔ لیکن بات صرف زحمت اور قیمت کی نہ تھی۔ بات دراصل ایک نئی طرح کی پابندی کی تھی، کہ اب پانی آپ کی مرضی کا تابع نہ تھا، آپ پانی والے کی مرضی کے تابع تھے۔ اگر پائپ نہ چلے تو پانی نہ ملے۔ پانی اب ایک قدرتی وسیلہ نہ تھا بلکہ انسانی مصنوعات کے زمرے میں آ گیا تھا۔

اکبر نے ایک بار قمر الدین احمد کو اپنا شعر سنایا۔

پائپ کوئی کھلا نہیں گھر میں لگی ہے آگ　　اب بھاگنا ضرور ہوا غور کیا کریں

قمر الدین احمد لکھتے ہیں کہ اکبر نے اس شعر کی توجیہ حسب ذیل بیان سے کی:

> [اکبر نے] فرمایا کہ تھوڑا عرصہ ہوا چوک کی دو کانوں میں آگ لگی۔ اس وقت پائپ بند ہونے سے رعایا کا سخت نقصان ہوا۔ میں نے مذکورہ شعر اس خیال سے متاثر ہو کر لکھا تھا۔ کیا کہا جائے۔ صاحب کی۔
>
> آب ودانے پہ حکمرانی ہے

اگر اس وقت زمانۂ سابق کی طرح کنویں ہوتے تو آگ بروقت قابو میں لائی جا سکتی تھی۔ شہروں میں ترمیم دیکھو کہ حکمراں طبقہ اور امراء سول لائن میں ہیں، غرباء کے لئے زیست کے دن گذارنے کے واسطے شہر کے گندے گوشے علیحدہ ہیں۔ مراد اس سے یہی ہے کہ امیر و غریب یکجانہ ہوں گے، نہ ایک دوسرے کے دکھ درد سے ہمدردی ہوگی۔ ۳۲

یہاں یہ بات بھی غور کرنے کے لائق ہے کہ اکبر نے رعایا کی تفریق اور تقسیم کی بات کی ہے، اور نئی طبقاتی حد بندیوں کے وجود میں آنے کی طرف جو اشارہ کیا ہے، وہ اپنے وقت سے بہت آگے کی بات ہے۔ بیسویں صدی کے اواخر میں کہیں جا کر شہری منصوبہ بندی کے ماہروں اور ماہرین اقتصادیات نے شہروں میں اس تفرقہ کی برائیاں محسوس کیں جو نئے نظام کے تحت انگریزوں نے یہاں رائج کی تھیں۔

ثقافتی قوت اور سماجی زندگی میں تسلسل کی علامت کے طور پر ہمارے یہاں دریاؤں کی اہمیت کنوؤں سے بھی زیادہ تھی۔ لوگوں کا خیال تھا کہ مختلف دریاؤں کا پانی الگ الگ خواص رکھتا ہے۔ بعض دریاؤں کا تقدس اس پر مستزاد تھا۔ یہ بات کچھ غیر معمولی نہ تھی کہ مسافر اپنے ساتھ گنگا، یا کسی اور پسندیدہ ندی کا پانی ساتھ لے کر چلتے تھے۔ محمد تغلق (زمانۂ حکومت ۱۳۲۵ تا ۱۳۵۱) جیسا عقلیت کوش سلطان بھی اپنا مرغوب گنگا جل ایک ہزار میل دور دکن دیس میں ہر روز منگاتا تھا۔ ۳۳

اکبر اعظم کے بارے میں ہمیں معلوم ہے کہ وہ گنگا کا ہی پانی پیتا تھا۔ لیکن پانی کے بارے میں اس کے یہاں اور تکلفات بھی تھے۔ ابوالفضل نے ان دریاؤں کا ذکر کیا ہے

جہاں کا پانی اکبر کے باورچی خانے میں استعمال ہوتا تھا۔[۳۴] حقیقت یہ ہے کہ مغل بادشاہوں کو ماحول کی آلودگی، پانی کی صفائی، اور اس طرح کی ''جدید'' چیزوں سے بہت شغف تھا، اور ظاہر ہے کہ اس شغف نے ایک طرف ہندوستانی تہذیب پر اثر ڈالا ہوگا تو دوسری طرف اس شغف کے پیدا ہونے میں خود ہندوستانی تہذیب اور رسوم کا بھی دخل رہا ہوگا۔ جہانگیر نے گجرات کے حالات میں لکھا ہے کہ یہاں کے لوگ پانی کو ٹھیک سے جمع نہیں کرتے ہیں۔ گجرات میں طریقہ تھا کہ صاحب ثروت لوگ اپنے تہ خانوں میں بڑے بڑے حوض بنا کر (جہانگیر نے لفظ ''برکہ'' لکھا ہے) ان میں پانی بھر کر بند کر دیا کرتے تھے، جہانگیر نے لکھا ہے کہ بھلا ایسا پانی کیوں کر نہ مضر ہوگا جسے مہینوں تک ہوا نہ لگے اور جس کے بخارات کو اٹھنے اور زائل ہونے کا موقع نہ ہو۔[۳۵]

آج کے وقت اور مقام کے قریب تر آیئے تو غالب کے خطوط ہیں جن میں دریاؤں کے پانی کا بطور خاص ذکر ہے۔ رام پور کی کوسی ندی کی ثناء میں غالب لکھتے ہیں:

> پانی کا شکر کس منھ سے ادا کروں۔ ایک دریا ہے کوسی، سبحان اللہ اتنا میٹھا پانی کہ پینے والا گمان کرے کہ یہ پھیکا شربت ہے۔ صاف، سبک، گوارا، ہاضم، سریع النفوذ۔

***

> پانی سبحان اللہ۔ شہر سے تین سو قدم پر ایک دریا ہے اور کوسی اس کا نام ہے۔ بے شبہ چشمۂ آب حیات کی کوئی سوت اس میں ملی ہے۔ خیر اگر یوں بھی ہے تو بھائی آب حیات عمر بڑھاتا ہے لیکن اتنا شیریں کہاں ہوگا۔[۳۶]

اس طرح کے طور طریقوں، رسوم ورواج، اور ندی یا دریا کے پانی کی اس مرکزیت کے نقصان نے اکبر سے حسب ذیل طرح کے شعر کہلائے۔ ہم انھیں قدامت پرستی کا اظہار سمجھیں تو یہ اکبر کے ساتھ زیادتی ہوگی۔

پانی پینا پڑا ہے پائپ کا حرف پڑھنا پڑا ہے ٹائپ کا
پیٹ چلتا ہے آنکھ آئی ہے شاہ ایڈورڈ کی دہائی ہے [۳۷]

شاہ ایڈورڈ کی دہائی میں طنز کی معراج ہے، اس کی وضاحت شاید ضروری نہ ہو۔ لیکن یہ ملحوظ رہے کہ ٹائپ کے حرف کے خلاف احتجاج صرف اس بناء پر نہ تھا کہ ٹائپ کے حرف چھوٹے ہوتے تھے۔ یہ معاملہ طریق پیداوار اور بلندی معیار پر مصنف کے قابو کا بھی تھا۔ طباعت کے زمانے کے پہلے کتابیں اکثر کسی خطاط سے نقل کرائی جاتی تھیں اور خطاط سے کام لینے والا شخص، جو اکثر مصنف ہی ہوتا تھا، اکثر اس کے کام پر ذاتی نگاہ رکھتا تھا۔ اور چونکہ ہر کتاب گویا اپنی جگہ پر بے نظیر تھی، اور خطاط اسلوب تحریر، روشنائی، سجاوٹ، حجم اور تقطیع، ہر چیز میں صاحب معاملہ کی مرضی کا پابند تھا، لہٰذا اس طرح جو کتاب تیار ہوتی تھی، اصولاً وہ اغلاط سے آزاد اور مطلوبہ معیار کی ہوتی تھی۔ اور ظاہر ہے کہ چھاپے خانے سے نکلنے والی کتاب پر مصنف کا کچھ واقعی قابو نہ تھا۔ لیکن اغلاط کے لئے بسا اوقات مصنف ہی کو مورد الزام ٹھہرایا جاتا تھا۔

غالب کی مثال سامنے کی ہے۔ وہ اپنی کتابوں پر مطبع کا نہیں، بلکہ اپنا قابو چاہتے تھے تا کہ معیار سے تجاوز نہ ہو۔ ان کے خطوط میں جابجا کاتب یا پریس یا پروف پڑھنے والے کے بارے میں شکایت ملتی ہے۔ "دستنبو" کی طباعت کے نگراں مرزا تفتہ تھے، انھیں نہایت اصرار سے غالب لکھتے ہیں: "کاپی کی سیاہی ذرا اور سیاہ اور رخشندہ ہو اور آخر تک رنگ نہ بدلے۔"[۳۸] اب

دیوان اردو کے بارے میں سنیئے:

ہر کاپی دیکھتا رہا ہوں۔ کاپی نگار اور تھا، متوسط جو کاپی میرے پاس لایا کرتا تھا وہ اور تھا... وہ الفاظ غلط جوں کے توں ہیں یعنی کاپی نگار نے نہ بنائے۔[۳۹]

جنون بریلوی کو غالب نے لکھا کہ کاتب کی غلطی بے وجہ مصنف کے سر مڑھ دی جاتی ہے۔ لوگ ''نسخہ مطبوعہ میں غلطی کا احتمال جائز نہیں رکھتے۔ کاپی نویس کے جرم میں مصنف بے چارہ ماخوذ ہوتا ہے''۔[۴۰]

اس طرح دیکھئے تو ٹائپ کے حرف کے خلاف خفیف مزاحیہ سے احتجاج کے پردے میں اکبر دراصل اس کثیر پیداواری تہذیب کی شکایت کر رہے ہیں جس میں کثرت اور عجلت کی خاطر معیاروں کو پست کر دیا جاتا ہے۔ جو چیز کہ پہلے فن پارے کا درجہ رکھتی تھی اب سرد اور بے جان طریقوں سے بنتی ہے اور اس میں اغلاط بے شمار ہوتے ہیں۔ انھیں وجوہ سے اکبر کو فوٹو گرافی بھی پسند نہ تھی اور گراموفون بھی، کہ دونوں ہی میں شخص اور اس کے صفات الگ ہو جاتے ہیں۔ اور چھپی ہوئی تصویر تو اور بھی ناپسندیدہ تھی کہ وہ نقل کی نقل ہے۔

ہم کو اپنے البم پر ناز کا ہے کیا محل بے حد ارزاں ہو گیا ہے اب تو فوٹو آپ کا
آپ کے درشن مصور کے بھی حصے میں نہیں بس لیا جاتا ہے فوٹو ہی سے فوٹو آپ کا[۴۱]

٭٭٭

کیا عجب ہو گئے مجھ سے مرے دمساز جدا دور فونو میں گلے سے ہوئی آواز جدا[۴۲]

کچھ ایسا ہی تناؤ، بلکہ شاید اس سے بدتر، ٹیلیفون کے ساتھ تھا، کہ ٹیلیفون نہ صرف لاشخصی ہے، بلکہ چونکہ اس پر بات کرتے وقت مخاطب سامنے ہوتا ہی نہیں، لہٰذا فون پر انکار

آسان ہوتا ہے۔

امید چشم مروت کہاں رہی باقی ذریعہ باتوں کا جب صرف ٹیلیفون ہوا[۴۳]

اکبر کی نگاہ میں اخبار بھی ایک طرح کا تہذیبی حملہ تھا۔ برطانوی تجارت اور برطانوی اطلاعات میں وہ کوئی فرق نہ دیکھتے تھے۔ (یہ فرق ہمیں اب نظر آرہا ہے جب اس کو قائم ہوئے ایک صدی گذر چکی)۔ دوسری بات یہ تھی کہ جارحانہ انداز فروشندگی کے باعث اخبار نہ صرف تجارت کا آلۂ کار تھا، بلکہ غلط اطلاعات کا بھی قاصد تھا۔ اشتہار کی دنیا میں ہر چیز اپنی جگہ پر بہترین تھی اور ہر چیز کسی اور ضرورت کو راہ دیتی تھی۔ پھر ایک پہلو یہ بھی تھا کہ اخباروں کا دبدبہ بہت تھا، لہٰذا بھولے بھالے ہی نہیں پڑھے لکھے ہندوستانی لوگ بھی اس بات کے مشتاق رہتے تھے کہ اخبار میں ان کا نام آجائے۔ اور اگر کوئی تحریر چھپ جائے تو کہنا ہی کیا ہے۔ اخبار کو اس قدر باعزت بنادینا اکبر کی نگاہ میں قومی وقار کے منافی تھا۔

چیز وہ ہے بنے جو یورپ میں بات وہ ہے جو پانیر میں چھپے[۴۴]

☆☆☆

اپنی گرہ سے کچھ نہ مجھے آپ دیجئے اخبار میں تو نام مرا چھاپ دیجئے

دیکھو جسے وہ پانیر آفس میں ہے ڈٹا بہر خدا مجھے بھی کہیں چھاپ دیجئے

چشم جہاں سے حالت اصلی چھپی نہیں اخبار میں جو چاہیئے وہ چھاپ دیجئے[۴۵]

☆☆☆

گھر کے خط میں ہے کہ کل ہوگیا جہلم اس کا پانیر لکھتا ہے بیمار کا حال اچھا ہے[۴۶]

☆☆☆

ہوائے طوبیٰ ہے اب نہ سر میں نہ موج کوثر ہے اب نظر میں ہوس اگر ہے تو بس یہی ہے کہ ہم بھی چھپ جائیں پانیر میں [۲۷]

٭٭٭

مجھے بھی دیکھئے اخبار کا ورق کوئی مگر وہ جس میں دواؤں کا اشتہار نہ ہو [۲۸]

آخری شعر خاص طور پر دلچسپ ہے۔ اپنی معمولہ ذکاوت اور دراکی کے باعث اکبر یہ بات جان گئے تھے کہ اشتہار چھاپنا اخباروں کا اصل کام نہیں۔ انگلستان میں جب اخبار چھپنا شروع ہوئے تو ان میں پارلیمنٹ کی بحثوں کی روداد کے سوا کچھ نہ ہوتا تھا۔ یہ تو انیسویں صدی کے صنعتی انقلاب اور اس کی پیدا کردہ خواندہ مل مزدوروں کی فوج کثیر کے باعث تھا کہ اخباروں میں جرائم، فوجداری مقدمات، اغواء، وغیرہ ''سنسنی خیز'' خبریں بھی شائع ہونے لگیں۔ اشتہار تو اور بھی دیر میں آئے، یعنی اس زمانے میں، جب اسمبلی لائن کا طریقۂ پیداوار وصنعت رائج ہوا اور ہر چیز بہت وافر تعداد میں بننے اور بنائی جانے لگی۔ اس طرح اخبار، جو اصلاً سیاسی تعلیم کا وسیلہ تھا، بڑے بزنس اور جارحانہ فروشندگی کے میدان کا اہم کھلاڑی بن گیا۔

اخبار کو اشتہار کا ذریعہ نہیں بنانا چاہیئے، ایسا لگتا ہے کہ انیسویں صدی کے ہندوستان میں بھی کئی لوگ اس خیال کے حامل تھے۔ اخبار کا انگریزی روپ جس میں وہ ہر فن مولا قسم کا رہنما تھا، ہندوستانی تہذیب کے ساتھ کچھ زیادہ ہم آہنگ نہ تھا۔ سرشار کا ''فسانۂ آزاد'' ایسا متن نہیں ہے جس میں ہندوستانی تہذیب، خاص کر ہندو مسلم مخلوط تہذیب کی ثناء خوانی ہو۔ سرشار کی نظر میں کوئی بات اسی وقت سچی ثابت ہوتی ہے جب انگریز اس کی تصدیق کرے۔ کتاب کے بالکل شروع میں میاں آزاد اور ایک حسین بازاری کی حسب ذیل گفتگو ملاحظہ ہو:

آزاد: آج پروفیسر لاک صاحب زبان پاک سنسکرت کی اشرفیت پر

لکچر دینے والے ہیں۔ یہ بزرگوار بڑے مقدس اور عالم یگانہ ، یکتائے زمانہ، مشہور دیار و امصار ہیں۔

چھمی جان: لاحول ولاقوۃ، بھئی خدا کی قسم کتنے بھونڈے ہو، کتنا خراب مذاق ہے۔ پروفیسر صاحب کے مشہور ہونے کی ایک ہی کہی۔ ہم اتنے بڑے ہوئے آج تک نام بھی سنا ہو تو قسم لیجئے۔ کیا دنی خاں سے زیادہ مشہور ہیں؟[۴۹]

ہندوستانی عورت کی دنیا کتنی تنگ اور اس کا دماغ کس قدر چھوٹا اور خرافات سے بھرا ہوا ہے، اس کو چھوڑیئے، اس بات کو دیکھئے کہ سنگرت [یعنی ہندوستانی تہذیب] کی خوبی بس اتنی، اسی حد تک، اور اسی وقت ہے جب کوئی مغربی [یعنی انگریز] عالم اس کی تصدیق کرے۔ میاں آزاد نمائندہ ہیں نئے انسان کے جس نے اس حقیقت کو سمجھ لیا ہے اور چھمی جان [یہاں وہ محض طوائف نہیں بلکہ پوری ہندوستانی تہذیب کی نمائندہ ہے] اس قدر الٹی عقل کی ہے کہ جب کوئی مغربی [انگریز] عالم اس کی خوبیاں بیان بھی کرنا چاہتا ہے تو وہ سنتی نہیں، اپنی ہی گاتی رہتی ہے۔ یہ تہذیب بے عقل بھی ہے اور زوال آمادہ بھی۔ اسے یقین نہیں کہ کوئی یورپی عالم اس کے طبیلے کے برابر شہرت یافتہ ہو سکتا ہے۔

خیر، تو اب اسی "فسانۂ آزاد" میں اخبار کا حال پڑھیں، پھر اکبر کے نقطۂ نظر کی بنیاد واضح ہو جائے گی۔ میاں آزاد کے ایک دوست بہار کو یہ بات کچھ پسند نہیں آئی ہے کہ اخبار میں کسی خالی اسامی کے بارے میں اشتہار چھپا ہے کہ لوگ اس کے لئے درخواست دیں:

بہار۔ خدا کامیاب کرے۔ لیکن سنیئے تو سہی، یہ تو اخبار ہے۔ اس

میں خلوئے عہدہ اور تنخواہ، اور درخواست کا کیسا جھگڑا؟ اس میں محاربے کا
حال، یا جنگ و جدال، علمی اور پولیٹیکل قیل و قال چاہیے یا یہ جنجال؟
آزاد: تو قبلہ آپ نے اخبار پڑھا ہی نہیں۔ پیرو مرشد، اخبار تو
عطر مجموعہ ہے۔لڑکوں کا اتالیق، جوانوں کا ناصح شفیق، بڈھوں کے تجربے کی
کسوٹی، رکن رکین سلطنت، تجار کا دوست، صناعوں کا یار غار، رعایا کا
وکیل، جمہور انام کا سفیر، مدبروں کا مشیر۔کسی کالم میں ملکی چھیڑ چھاڑ،
کہیں سوشل امور میں تکرار۔ کہیں اشعار آبدار، کہیں نوٹس اور اشتہار۔
انگریزی اخباروں میں طرح طرح کی باتیں درج ہوتی ہیں، اور دیسی
اخبار بھی ان کا تتبع کرتے ہیں۔۵۰

ظاہر ہے کہ یہاں بھی میاں آزاد نئے انسان کی نمائندگی کر رہے ہیں۔ان کے لئے اخبار صرف اطلاعاتی کاغذ نہیں، تعلیم کا بدل اور ذہنوں پر قبضہ قائم کرنے کا طاقتور وسیلہ ہے۔میاں آزاد کو اخبار کی ہر فن مولائی طریقۂ فروشندگی، ذاتی معاملات کو برسر عام زیر بحث لانے کی ادا، یہ سب باتیں بھلی لگتی ہیں، اور اکبر کو انھیں کی بناء پر اخبار سے شکایت ہے۔اخبار ایک مادہ پرستانہ اور دنیادارانہ شے ہے۔اکبر کی نظر میں اس کا اولین مقصد علم یا اطلاع کا فروغ نہیں، تجارت اور انگریزی حکومت کے انتظامی اور سیاسی مفادات و مقاصد کا فروغ ہے۔ پدم سنگھ شرما کے نام ایک خط میں اکبر نے اخبار کو ان اشیاء کی ضمن میں رکھا تھا جو ان کے خیال میں تفریق اور چشمک کو پھلنے پھولنے کا موقع دیتی ہیں:

ایک ایک بادۂ خود پرستی میں محو و سرشار ہے۔کونسل اور کمیٹی اور اخبار

موجود ہے۔ پھر آپس میں محبت بڑھانے، بھائی چارہ کرنے کی کیا ضرورت ہے۔[51]

برطانوی حکومت کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مقاصد کو اخبار سے بھی زیادہ بہتر طور پر کوئی پورا کرتا تھا تو وہ ریل گاڑی تھی۔ اکبر نے مال گاڑی، ریل، اور انجن کا تذکرہ بار بار کیا ہے۔

مال گاڑی پہ بھروسا ہے جنھیں اے اکبر   ان کو کیا غم ہے گناہوں کی گراں باری کا[52]

٭٭٭

تنہائی و طاعت کا یہ دور ہے اب دشمن   پیڑوں پہ نہ وہ طائر صحراء پہ نہ وہ جوبن
جنگل کے جو تھے سائیں وہ ریل کے ہیں پائیں   املی کی جگہ سگنل قمری کی جگہ انجن[53]

اکبر کے ماحولیاتی سروکار اور ترددات اپنے زمانے سے آگے تو ہیں ہی، اپنی شدت میں وہ ان کے سماجی اور سیاسی ترددات سے کم نہیں۔ مومن کے شاگرد میر حسین تسکین دہلوی کا یہ شعر سب کا سنا ہوا ہوگا۔

ابھی اس راہ سے کوئی گیا ہے   کہے دیتی ہے شوخی نقش پا کی[54]

اکبر کی پیروڈی انتہائی پر لطف لیکن اندر ہی اندر تلخی سے بھری ہوئی بھی ہے۔

ابھی انجن گیا ہے اس طرف سے   کہے دیتی ہے تاریکی ہوا کی[55]

ریلوے انجن نے جدید انسان کو رعونت اور غیر ضروری خود اعتمادی سے بھر دیا ہے۔

سنتے نہیں ہیں شیخ نئی روشنی کی بات   انجن کی ان کے کان میں اب بھاپ دیجیے[56]

٭٭٭

آگے انجن کے دین ہے کیا چیز   بھینس کے آگے بین ہے کیا چیز[57]

اکبر نے ریلوے انجن کا ذکر بڑی تلخی اور طنز اور کثرت سے کیا ہے۔ ریل کے فوائد سے تو سبھی آگاہ تھے، لیکن ریل کے سماجی اور تہذیبی نقصانات پر اکبر کی نظر جس طرح پڑی ہے اس کی مثال مل نہیں سکتی۔ انھیں پورا احساس تھا کہ نوآبادیوں کے اقتصادی استحصال کے آلے، اور نظام حکومت میں ایک طاقتور سیاسی بیان کے طور پر ریل گاڑی ایک نہایت مؤثر ایجاد ہے۔

اس کا پسیجنا ہے اور اس کے ہیں بھپارے　　یورپ نے ایشیا کو انجن پہ رکھ لیا ہے[۵۸]

میں نے اس مضمون میں اکبر کی زبان اور ان کے اسلوب کے حسن پر اظہار خیال کرنے سے گریز کیا ہے۔ لیکن یہاں میں ''انجن پہ رکھ لیا ہے'' کے زور اور بلاغت کی داد دیے بغیر نہیں رہ سکتا[۵۹] تلوار پر رکھ لینا، تلوار کی باڑھ پر رکھ لینا، گولیوں کی باڑھ پر رکھ لینا، وغیرہ محاورے تو ہیں ہی، انگریزی کا محاورہ To put to the sword بھی ذہن میں آتا ہے۔ پھر ''پہ رکھ لیا ہے'' میں شکار مار کر گھوڑے کی پشت یا زین پر رکھ لینے کا پیکر صاف نظر آتا ہے۔ ''پہ رکھ لیا'' میں ملازم رکھنے'' یا ''ڈیوٹی پر لگانے'' کا مفہوم بھی ہے۔ اور بھی نکات ہیں، لیکن بات یہاں ختم کرتا ہوں کہ اکبر نے صرف ہندوستان اور برطانیہ کا ذکر نہیں کیا ہے، ایشیا اور یورپ کی بات کی ہے۔ مزید کچھ شعر دیکھئے۔

مشینوں نے کیا نیکوں کو رخصت　　کبوتر اڑ گئے انجن کی پیں سے[۶۰]

***

کہتے ہیں راہ ترقی میں ہمارے نوجوان　　خضر کی حاجت نہیں ہم کو جہاں تک ریل ہے[۶۱]

اکبر الٰہ آبادی اور اقبال ہمارے اولین اور سب سے بڑے پس نوآبادیاتی ادیب ہیں۔ دونوں کو برطانوی طرز فکر و حیات کی اچھی واقفیت تھی اور دونوں ہی کو مغرب کچھ مرعوب نہ

کر سکا۔ اس بات کو مدنظر رکھیں کہ بیسویں صدی کے اوائل اور انیسویں صدی کے اواخر میں ہمارے دانشور سب کے سب مغرب کی ذہنی غلامی میں مبتلا تھے، تو یہ کوئی معمولی بات نہیں۔[٦٢] مغرب کے بارے میں اقبال کی معلومات براہ راست تھیں اور مغرب سے ان کے اختلاف کی بنیادیں فلسفیانہ اور دانشورانہ تھیں۔ عبدالماجد دریابادی کے نام اکبر کے خطوط سے معلوم ہوتا ہے کہ خود اکبر بھی مغربی افکار سے بیگانہ نہیں تھے۔[٦٣] لیکن ان کے سروکار اور ترددات زیادہ تر عملی دنیا کے معاملات سے تعلق رکھتے تھے۔ اکبر کو جدید ہندوستان کے سماجی، سیاسی، اور مذہبی مسائل سے دلچسپی تھی۔ اقبال کا خیال تھا کہ انھوں نے ہندوستان، اور خاص کر ہندوستانی مسلمان کے مسائل کے ایسے حل ڈھونڈ لئے ہیں جو عملی بھی ہیں اور فلسفیانہ بھی۔ لیکن اکبر اس نتیجے پر پہنچے تھے کہ کچھ زیادہ اصلاح حال ممکن نہیں۔ انھوں نے ۲ نومبر ۱۹۱۲ کے مکتوب میں پدم سنگھ شرما کو لکھا:

> زمانے کا رنگ آپ دیکھ رہے ہیں۔ جھوٹی عزت اور نقصان رساں لذتوں کا شوق طبیعتوں پر غالب ہے۔ نام ہے ملکی ترقی کا لیکن کوشش ان باتوں کی ہو رہی ہے جن سے سوسائٹی ٹکڑے ٹکڑے ہو جائے۔[٦٤]

اسی طرح، اپنی شاعری کے بارے میں ۱۹۱۷ کے ایک خط میں اکبر نے سید سلیمان ندوی کو لکھا:

> یہ نظمیں انقلاب روکنے کے لئے نہیں ہیں، یادگار انقلاب ہیں۔ حصہ دوم میں یہ شعر پائیے گا۔

نظم اکبر کو سمجھ لو یادگار انقلاب   یہ اسے معلوم ہے ٹلتی نہیں آئی ہوئی[٦٥]

خیال رہے کہ ''آئی'' کے معنی ''موت'' بھی ہیں۔ اس لفظ کا استعمال اشارہ کرتا ہے کہ

اکبر کو خوب معلوم تھا کہ نیا سماج اور نیا نظام تو بہر حال آکر رہے گا۔ دیکھنا صرف یہ تھا کہ پرانی تہذیبی اقدار کہاں تک ضائع ہونے سے محفوظ رکھی جا سکتی ہیں۔ وہ خود کو ایسی فوج کے پچھلے دستے کا سپاہی سمجھتے تھے جس کے پاؤں تو اکھڑ ہی چکے تھے، اور وہ بس مؤخرہ صفوں میں کھڑے نبرد آزمائی کر رہے تھے۔ اسی باعث ان کی آواز میں تلخی کے ساتھ ساتھ گہرا درد بھی ہے۔ مغربی اقدار، مغربی طرز حکومت، اور پرانے اقدار کو ترک کر کے نئے کو اپنانے پر جو اصرار ان کے زمانے میں ہو رہا تھا، اکبر نے بے سوچے سمجھے اور محض قدامت پرستانہ ضد کی بناء پر ان کی مخالفت نہ کی تھی۔ بے شک ان کی تمنا تھی کہ ملک آگے بڑھے، جدید بنے، لیکن انھیں اس کی قیمت کے طور پر ہندو مسلم نفاق، اردو ہندی جھگڑا، عزت نفس کا زیاں، اقدار کو کہنہ قرار دیا جانا، مذہب اور تاریخ کا مسخ کیا جانا جیسی باتیں منظور نہ تھیں۔ ممکن ہے کہ آج ہم میں سے کچھ لوگ خیال کریں کہ اکبر نے ضرورت سے زیادہ شدید ردعمل ظاہر کیا، یا پھر وہ معاملے کو کچھ سادہ اور سہل بنا کر پیش کر رہے تھے۔ لیکن اکبر کے اور ان کے موقف کی بنیادی درستی سے انکار نہیں کیا جا سکتا۔ وہ اخبار، یا ریل گاڑی، کے خلاف نہ تھے، نہ وہ ان چیزوں کے خلاف تھے جنھیں انگریزی حکومت ''عوامی بہبود'' کے کام کہتی تھی۔ انگریزی عہد میں محکمۂ تعلیم کو public Instruction کا محکمہ کہتے تھے۔ عمارتوں کی تعمیر کے محکمے کو اب بھی Public Works کا محکمہ کہا جاتا ہے۔ ''پبلک'' کے نام پر یہ محکمے ہمارے تہذیبی ورثے کا استحصال کر رہے تھے اور انگریزوں کی سیاسی اور اقتصادی برتری کو قائم کرنے، مستحکم کرنے، اور پھیلانے میں معاون تھے۔ ہم جانتے ہیں کہ بعد کی تاریخ نے اکبر کو بڑی حد تک صحیح ثابت کیا ہے۔

صدیق الرحمن قدوائی ان معدودے چند اردو نقادوں میں ہیں، جنھوں نے اکبر کی

ظرافت کو اہمیت کی نگاہ سے دیکھا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ اکبر خود پر ہنستے ہیں اور اس ہنسی کی تہ میں احساس شکست بھی ہے، لیکن اس کی تہ میں کہیں یہ علم بھی پنہاں ہے کہ دشمن، جو بظاہر کامیاب ہے، بالآخر اس کو ہم سے بھی بدتر شکست نصیب ہو گی۔[٦٦] میرا خیال ہے یہ ذرا زیادتی کی بات ہے کہ اکبر کو بڑا شاعر ثابت کرنے کے لئے ہم انھیں مستقبل بینی کی بھی صفت سے متصف دیکھیں جو در حقیقت ان میں تھی نہیں۔ ہاں یہ بات ضرور ہے کہ اکبر خاصے مضبوط دل و دماغ کے شخص تھے، وہ کوئی چھوٹی موئی قسم کی چیز نہ تھے۔ شکست خوردگی ان کے کلام میں ہو یا نہ ہو، لیکن تھڑدلا پن اور گھبراہٹ کہیں نہ تھی۔

رالف رسل کا بھی خیال ہے کہ اکبر کی شاعری اور شخصیت میں کچھ اسی قسم کی عقیلت پسندی اور سرد ہوشمندی تھی جیسی وسط بیسویں صدی کے بعض مفکروں میں نظر آتی ہے، اور جو خود شاید رسل صاحب کی فطرت کا خاصہ ہے۔ شاید اسی لئے رسل نے لکھا ہے کہ "اکبر ان شعراء میں ہیں جو نئی اور پرانی روشنی کی آویزش کو دیکھتے ہیں لیکن وہ کسی ایک کی مکمل اور بے روک ٹوک حمایت نہیں کرتے۔"[٦٧] اس کے برخلاف، رسل اور خورشید الاسلام کی اس بات میں زیادہ وزن ہے کہ "اکبر ہرگز کاٹھ کی طرح کٹر اور تخیل سے عاری اور ضدی قدامت پرست نہیں ہیں جیسا کہ بعض نے انھیں بیان کیا ہے.... اصلاً اور بنیادی طور پر وہ ایک ایسے شخص ہیں جسے تبدیلی کا احساس شدت سے ہے اور جو تبدیلی کے نامقاومت پذیر ہونے کا بھی احساس رکھتا ہے۔"[٦٨]

جو تصور اکبر کی شاعری آخرکار ہم پر چھوڑ جاتی ہے وہ ایسے شخص اور شاعر کا ہے جسے معاملات کی سیاسی تہوں اور معنویتوں کا گہرا اور فوری احساس تھا۔ ایسا شاعر جس نے غضب کی حس مزاح اور طباعی قدرت پائی تھی اور جس نے اپنے زمانے کے سماجی، سیاسی اور تہذیبی مسائل پر ناقابل یقین حد تک لسانی حسن اور نت نئے مضامین کی زرخیزی کے ساتھ لکھا۔ اگر کسی کو اکبر کے پیغام سے محبت نہ ہو (اور آج ایسے بہت سے ہیں) تو بھی وہ اکبر کی شدید حب الوطنی، اور انگریزوں کے خلاف ان کے دل میں اتنی ہی شدید نفرت کا احساس کئے بغیر نہیں رہ سکتا۔

ہندوستانیوں سے جب انگریزوں نے سماجی سطح پر میل جول شروع کیا تو انھوں نے ہندوستانیوں کو مغرور، نازک مزاج، اور نفاست پر خاص زور دینے والا، بلکہ انگریزوں کو بہ نگاہ تحقیر دیکھنے والا قرار دیا۔ انیسویں صدی کی آخری تہائی تک یہ سب بدل جاتا ہے۔ اب زیادہ تر ہندوستانی، علی الخصوص دانشور ہندوستانی، اس رائے کے ہو جاتے ہیں کہ ہندوستانی کے مقابلے میں یورپین، خاص کر انگریز، کی اخلاقی اور فنی برتری پر جو بھی کہا جائے کم ہوگا۔ اکبر اور اقبال یہاں ممتاز نظر آتے ہیں، اور انگریز کو اکبر جتنا ناپسند کرتے تھے اس حد تک شاید اقبال بھی انھیں ناپسند نہ کرتے ہوں گے۔

اکبر نے ڈارون کے نظریہ ارتقاء پر کئی دلچسپ طنزیہ شعر لکھے ہیں۔ سب سے مشہور ترین حسب ذیل دو شعر کی نظم ہے جس میں حافظ کا ایک مصرع بڑی خوبی سے چسپاں کیا گیا ہے۔

کہا منصور نے خدا ہوں میں　　ڈارون بولے بوزنا ہوں میں

ہنس کے کہنے لگے مرے اک دوست　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

ہم اوپر دیکھ چکے ہیں کہ اکبر نے ایک عشقیہ شعر کی پیروڈی کر کے اسے کیا سے کیا بنا دیا تھا۔ یہاں وہ حافظ کے مشہور تر عشقیہ شعر کی دنیا سے جدید سائنسی فکر پر اظہار خیال کا نکتہ ڈھونڈ نکالتے ہیں۔ حافظ کا شعر ہے۔

تو و طوبیٰ و ما و قامت یار　　فکر ہر کس بقدر ہمت اوست"

خیر، پیروڈی، اور دوسروں کے مقولوں کو اپنے مطلب کا بنا کر برتنا تو اکبر کے خاص فنوں میں سے ایک فن تھا۔ اور جگہ انھوں نے طنز کی وہ چھریاں چلائی ہیں کہ توبہ ہی بھلی۔

قمر الدین احمد بدایونی لکھتے ہیں کہ ۲۸ر جنوری ۱۹۲۱ کو ایک گفتگو میں اکبر نے کہا:

اگر ڈارون کی یہ تھیوری درست ہے کہ انسان بندر سے پیدا ہوا ہے تو اس منزل تمدن پر اہل یورپ کو انسانیت کے بہت سے اعلیٰ محاسن کا حامل ہونا چاہیئے تھا۔ مگر ایسا نہیں۔ اس پر افسوس کرتا ہوں۔

یا الٰہی یہ کیسے بندر ہیں ارتقاء پر بھی آدمی نہ ہوئے [۴۱]

اس طرح اکبر کی شاعری میں تہذیبی تاریخ کا چرخ پورا ہوتا ہے: بجائے اس کے کہ انگریز لوگ ہمیں حقارت سے دیکھیں، ہم انھیں حقارت اور مایوسی سے دیکھتے ہیں۔ اکبر کو اپنے شاعرانہ مرتبے کا پورا احساس تھا۔ بھلے ہی آج کے لوگ انھیں جوکر، یا قدامت پرست بھانڈ قسم کی چیز سمجھنے لگے ہوں، لیکن خود اکبر اس بات پر پوری طرح آگاہ تھے کہ ان کے مقاصد جلیل و سنجیدہ تھے اور وہ الفاظ کے بہت بڑے پارکھ اور بہت بڑے فنکار تھے۔

بہت سے اردو کے نقاد مصر ہیں کہ اکبر الہ آبادی ترقی اور روشن فکری کے اندھے مخالف تھے۔ امید ہے کہ موجودہ تحریر نے اس رائے کے جھوٹ کو ثابت کرنے میں کچھ خدمت انجام دی ہوگی۔ لیکن اتنا تو ضرور ہے کہ اکبر میں عزتِ نفس کا پاس اور قومی افتخار کا احساس ان کے نکتہ چینوں سے زیادہ تھا۔ اور شاعر کی حیثیت سے انھیں جزئیات بین آنکھ اور انتہائی تیز کاٹ رکھنے والی طباعی ودیعت ہوئی تھیں۔ [۴۲] پھر انھیں اردو شاعری کے آہنگوں کا غیر معمولی احساس تھا، اور ان کی تکنیکی مہارت ایسی تھی کہ اقبال کے سوا اس کی نظیر نہیں ملتی۔ معاصر دنیا پر رائے زنی کرنے والے کی حیثیت سے ان کے کلام میں وہ دانش ورانہ توانائی، وہ برفیلا جذبۂ تحقیر، اور وہ بھڑکتا ہوا غصہ ہے جو اٹھارویں صدی کے بعد ہمارے یہاں ناپید تھا۔ لیکن یہ سب ہوتے ہوئے بھی اکبر کا دل درد سے بھرا ہوا تھا۔ اپنی تاریخ اور تہذیب کا ضیاع وزیاں ان پر بہت شاق تھا، شاید خاص کر اس وجہ سے، کہ وہ جانتے تھے کہ میں خود بھی کسی نہ کسی طرح سے ان طاقتوں کا حصہ ہوں جو میرے ورثے کو لئے جا رہی ہیں۔ شاید ان کا یہ شعر ان کے لوحِ مزار کے لئے مناسب ہوتا۔

جو گذرو گے ادھر سے میرا اجڑا گاؤں دیکھو گے شکستہ ایک مسجد ہے بغل میں گورا بارک ہے [۴۳]

حواشی

۱ ملاحظہ ہو: رقعات اکبر مرتبہ ساحل احمد، اردو رائٹرز گلڈ، الہ آباد، ۱۹۹۷، ص ۱۸۔ اکبر کے خطوں کا یہ مجموعہ پہلی بار لاہور سے محمد نصیر ہمایوں نے شیخ عبدالقادر کے پیش لفظ کے ساتھ شائع کیا تھا۔ ساحل احمد نے اب اسے مفصل حواشی اور کچھ اضافوں کے ساتھ شائع کیا ہے۔

۲ مکتوب علامہ اقبال مورخہ ۱۷ ردسمبر ۱۹۱۴، بنام اکبر الہ آبادی۔ مشمولہ ''کلیات مکاتیب اقبال'' جلد اول مرتبہ سید مظفر حسین برنی، دہلی اردو اکیڈمی، ۱۹۹۱، ص ۳۲۰۔

۳ کلیات اکبر، جلد سوم، اسرار کریمی پریس، الہ آباد، ۱۹۴۰، ص ۱۵۴۔

۴ آب حیات از محمد حسین آزاد، کلکتہ، ۱۹۶۷، ص ۱۸۷۔

۵ تنقیدی اشارے، آل احمد سرور، نذیر احمد اینڈ سنز، علی گڑھ، ۱۹۴۲، ص ۸۷۔

۶ کلیات اکبر، جلد سوم، ص ۱۵۷۔

۷ کلیات اکبر، جلد اول، الہ آباد، اسرار کریمی پریس، ص ۲۰۷/۸۔

۸ اکبر کے یہاں مذہبی طور طریق میں بھی تضاد کو انگیز کرنے کی کچھ ایسی ہی ادا پائی جاتی ہے۔ وہ خود راسخ العقیدہ سنی تھے، لیکن ان کی دوسری بیوی، جن کی محبت نے ان سے پہلی بیوی چھڑا دی، شیعہ تھیں۔ لیکن عمر کے ساتھ اکبر کے مزاج میں تشیع کے خلاف تعصب بھی بڑھتا گیا۔ دوسری طرف یہ بھی ہے کہ اکبر نے عشرت حسین کی شادی ایک شیخ زادے کی بیٹی سے کی۔ شیخ صاحب اصلاً سنی تھے، لیکن شیعہ بیوی کر کے خود بھی شیعہ ہو گئے تھے۔ اکبر کے مذہبی معاملات کا تیسرا پہلو یہ ہے کہ ایک زمانے میں مشہور ہوا کہ عشرت حسین نے شیعیت اختیار کر لی ہے۔ اکبر کو اس بات پر بڑا تردد ہوا اور انھوں نے سر شاہ محمد سلیمان سے کہا کہ عشرت حسین کو تشیع کی طرف مائل ہونے سے روکئے۔ لیکن شاہ صاحب نے گول مول سا جواب دیا کہ آپ یہ معاملہ عشرت حسین کی موجودگی میں اٹھائیں تو میں ضرور کہوں گا۔ اکبر چاہتے تھے کہ عشرت حسین کے ایک بیٹے محمد عقیل کی تعلیم ندوۃ العلماء لکھنؤ میں ہو۔ لیکن یہ بیل شاید منڈھے چڑھی نہیں۔ ملاحظہ ہو، بزم اکبر از قمرالدین احمد بدایونی، دہلی، انجمن ترقی اردو (ہند)، ۱۹۴۰، ص ص ۲۵، ۲۷، ۱۶۱، اور رقعات اکبر، ص ص ۲۴/۲۵۔

۹ کلیات اکبر، جلد دوم، لکھنؤ، ادبی پریس، ۱۹۳۱، ص ۳۰۔

۱۰ کلیات اکبر، جلد اول، ص ص ۱۶۱/۲۔

۱۱ کلیات اکبر، جلد اول، ص ۱۔